امام خمینی اور ایران کے سیاسی حالات

(مشروطہ سے رضاخان کے مظالم تک)

از: محمد حسن رجبی

اسی زمانہ میں جرمنی کے طاقتور حکومت کی زیادتیوں کیخلاف برطانیہ اور روس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور ان دنوں ملکوں نے مسئلہ ایران کے ساتھ اپنے تمام باہمی اختلافات کو حل کرنا شروع کردیا۔ اس معاہدہ کے بعد برطانیہ نے' جو اب تک تحریک مشروطیت کی حمایت کررہا تھا، مشروطہ طلب جماعت کی طرفداری کرنا چھوڑ دی اور روس کو اس بات کی کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ ایران کی نو تشکیل شدہ مشروطہ حکومت کا کام تمام کردے کیونکہ نظام مشروطیت روس کے آزادی طلب اور انقلاب پسند عناصر کے لئے امید کی روشن کرن اور حکومت روس کے لئے ایک بڑا خطرہ رہا ہے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں ایرانی پارلیمنٹ کے بعض تندرو اراکین نے اپنی دہشت گردانہ حرکتوں کی وجہ سے محمد علی شاہ کو ایک مناسب بہانہ فراہم کردیا کہ وہ ظالم قزاقی فوجی افسروں کی مدد سے ایرانی پارلیمنٹ پر بمباری کے ذریعہ اسے تباہ وبرباد کرڈالے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس بمباری کے دوران کچھ اراکین مارے گئے کچھ زخمی ہوئے اور کچھ گرفتار کرلئے گئے۔ دلچسپ اور غور طلب بات یہ ہے کہ دہشت گردانہ حرکتوں میں ملوث، شدت پسند اراکین پارلیمنٹ جو دوسروں کو حکومت کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے، اس بمباری کے دوران روپوش ہوگئے یا برطانوی سفارت خانہ کے اندر پناہ گزیں ہوگئے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی اور پارلیمنٹ کی تشکیل کے کئی ماہ بعد بھی ایران کو امیدوں کے برعکس کوئی مفید عملی اقدام نظر نہ آیا بلکہ مسائل ومشکلات ، بے سروسامانی ومفلوک الحالی نیز بدامنی اور عدم سلامتی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کے عوام نے یہ بھی دیکھا کہ اراکین مجلس کے درمیان تفرقہ واختلاف اور گروہ بندی کا بازار گرم ہے اور یہ لوگ عوامی فلاح وبہبود کے بجائے ذاتی مفاد ومصالح کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں لہٰذا ایرانی عوام، پارلیمنٹ اور اس کے اراکین سے پوری طرح ناامید اور بے تعلق ہوگئے۔ چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب شاہی فوج نے پارلیمنٹ پر حملہ کیا تو ایرانی عوام کی طرف سے کوئی رد عمل دکھائی نہ پڑا۔ یہ بات صرف تہران تک محدود نہ تھی بلکہ ایران کے دیگر شہروں میں بھی کسی نے

کوئی احتجاج نہ کیا۔

شاہ شاہی دربار کے اعلیٰ حکام اور انقلاب مشروطیت کے مخالفین اس لڑائی میں ایک فاتح کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آ گئے اور ان لوگوں نے مشروطہ طلب افراد کے خلاف ظلم نا انصافی کا بازار گرم کردیا ارو ایرانی عوام کی عزت وآبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ ان نام نہاد فاتحین نے ایرانی عوام پر بڑے مظالم ڈھائے۔ جب لوگوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کی عزت آبرو اور ملکیت وزندگی ان مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ کا کھلونہ بن چکی ہے تو انہوں نے دفاعی کارروائی شروع کی۔ تبریز میں ستارخان اور باقرخان نے ظالم شاہی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے لوگوں سے یہ اپیل کی کہ وہ حکومت کی ظالمانہ راہ وروش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ عوام نے ان کی اس احتجاجی اپیل کا پرجوش استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر احتجاجی جماعت کے ہاتھوں میں آ گیا۔ شاہ نے تبریزی عوام کی اس بقالی تحریک کو کچلنے کے لئے ایک بڑا فوجی دستہ روانہ کیا کیونکہ اسے ڈر یہ تھا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کی یہ آگ ایران کے دوسرے شہروں میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ تبریز کے لوگوں نے اس ظالم شاہی فوجی دستہ کا بھرپور مقابلہ کیا جس کی وجہ سے حکومت، اس احتجاجی تحریک پر غلبہ نہ حاصل کرسکی۔ دوسری طرف علمائے عراق (مثلاً آخوند خراسانی مازندرانی اور تہرانی) اپنے جوشیلے بیانات اور انقلابی پیغامات کے ذریعہ لوگوں سے یہ مطالبہ کررہے تھے کہ شاہی مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ان علماء کی نظر میں ظالم شاہی حکومت کا مقابلہ کرنا امام زمانہ (عج) کے ہمراہ دشمنان خدا کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ مذہبی علماء کے ان بیانات اور مذہبی احکامات نے انقلابی عوام کے حوصلوں میں غیر معمولی اضافہ کردیا چنانچہ وہ حکومت کے خلاف اپنی انقلابی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ جیسے جیسے ایران کے دوسرے شہروں میں انقلاب تبریز کی خبر پہنچی اور لوگوں کو علمائے عراق کے انقلابی پیغامات کا علم ہوا، وہ لوگ بھی بڑے جوش وخروش کے ساتھ حکومت کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔

برطانیہ اور روس کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتحال پر قابو پانا ایرانی حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، لہٰذا ان دونوں ملکوں نے مختلف پہلوؤں سے کام کرنا شروع کردیا۔ ان لوگوں نے ایک طرف تو شاہ ایران کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کو تسلیم کرلے۔ دوسری طرف ایک دھمکی آمیز مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے مشروطیت طلب علماء سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی انقلابی سرگرمیوں سے باز آجائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ روسی فوج شہر تبریز کے اندر داخل

ہوگئی اور شہر کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔

لیکن علماء بالخصوص آخوند خراسانی نے ان دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ مجاہدین تبریز کی حمایت کرنے کے لئے ایک جماعت کے ساتھ تبریز پہنچ کر انقلابی عوام کی قیادت و رہنمائی کریں۔ چنانچہ یہ علماء دسیوں ہزار مسلح اور غیر مسلح عراق عوام بالخصوص اہل نجف کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہوگئے ۔ جیسے ہی برطانیہ اور روس کو علماء عراق کے اس شدید ردعمل کی خبر ملی تو ان لوگوں نے گیلان اور بختیاری کے دو نامور لوگوں کو جو درحقیقت ان بیرونی ممالک کے ایجنٹ تھے، اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کا پرچم لئے ہوئے آگے قدم بڑھائیں اور ایرانی عوام کی اس انقلابی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور شمال وجنوب کے راستہ سے تہران پر قبضہ کرلیں۔

ادھر عراقی علماء ہزاروں مسلح و غیر مسلح افراد کے ہمراہ نجف سے کربلا پہنچ چکے تھے جیسے ہی انہیں کربلا میں فتح تہران کی اطلاع حاصل ہوئی انہوں نے سفر تہران کا ارادہ ترک کردیا اور سب لوگ نجف واپس چلے گئے اور فاتحین نے اقتدار کو آپس میں اس طرح تقسیم کرلیا کہ روسی اور برطانوی ایجنٹوں کے درمیان توازن برقرار رہے۔''مجاہد'' کے لقب سے مشہور ان حکمرانوں نے سب سے پہلے انقلاب مشروطیت کے مخالفین کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کیا جس میں شیخ فضل اللہ نوری بھی شامل تھے۔ شیخ فضل اللہ نوری کو ایک ایسے عالم نما قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا جو فری میسن نامی برطانوی تنظیم سے وابستہ تھا۔ اس قاضی نے انہیں پھانسی کی سزا سنائی اور ۱۳/رجب ۱۳۲۷ء ہجری یعنی یوم ولادت حضرت علی علیہ السلام کے موقع پر تہران میں واقع توپخانہ گراونڈ پرانہیں پھانسی دیدی گئی تاکہ ایرانی عوام آئندہ انکی برسی کے سلسلے میں مجلس سوگ وعزا کا اہتمام نہ کرسکیں۔ دوسری طرف مظفر الدین شاہ کے ظالم صدر اعظم عین الدولہ کو جو انقلاب مشروطیت کا سخت مخالف اور اکثر مجاہدین انقلاب کا قاتل بھی تھا۔فاتح حکام اور افسروں کے سامنے پیش کیا گیا اور ان لوگوں نے نہ صرف معافی دیدی بلکہ اس کے ساتھ ایک یادگاری تصویر بھی کھنچوائی گئی!

حاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت سے ایرانی عوام بالخصوص علمائے دین بہت متاثر ہوئے اور پورے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ شیخ فضل اللہ نہ صرف یہ کہ تہران کے ایک نامور عالم دین تھے بلکہ شاہی حکومت کے خلاف تحریک تمباکو میں انہوں نے نمایاں خدمات بھی انجام دی تھیں۔ وہ

تحریک مشروطیت کے آغاز سے پارلیمنٹ کی تشکیل تک اس کے بعد مجوزہ آئین کے سلسلے میں ہونے والے مباحثہ کے دوران دیگر علمائے دین کے ساتھ رہے اس کے علاوہ ایک نمایاں مجتہد کی حیثیت سے وہ اپنے حق وفریضہ سے بخوبی واقف تھے اور اپنی اجتہادی صلاحیت کی بنیاد پر ہی انہوں نے مجوزہ آئین کی غیر معمولی اسلامی دفعات کی مخالفت کی تھی اور اسے ''بدعت'' کہا تھا۔

بہر حال شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے سب سے پہلے علماء عراق کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا کیونکہ یہ شہادت درحقیقت علماء دین کی بے حرمتی کا پیغام تھی۔ اس کے علاوہ نجف اشرف میں ایسے علمائے دین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو شیخ فضل اللہ کے ہم خیال تھے۔ ان لوگوں میں اس دور کے مرجع تقلید سید کاظم یزدی بھی شامل تھے جو بنیادی طور پر سیاست میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے اور ایران وعراق وروس میں ان کے مقلدین ومعتقدین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

واضح رہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مشروطیت اور اس کے طرفداروں کے سلسلے میں علماء عراق کے درمیان بڑی بدگمانیاں موجود تھیں چنانچہ شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے علمائے دین کی بدگمانی کو یقین میں تبدیل کردیا اور لوگوں کو ایک عمدہ دلیل مل گئی۔ دوسری طرف عراق کے جن مشروطہ طلب علماء نے شیخ کی شہادت پر سکوت وشرمندگی کا رویہ اختیار کیا، ان سے سوالات کی بھر مار ہوگئی اور بالآخر انہیں گوشہ نشین ہونا پڑا۔ دوسری طرف ایران سے حاصل شدہ اطلاعات سے یہ بھی پتہ چل رہا تھا کہ حقیقی مشروطہ طلب افراد کو طرح طرح سے پریشان کیا جارہا ہے اور ان کی جان وعزت وآبرو خطرہ میں ہے۔

حاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت کے تقریباً ایک سال بعد تہران کے دوسرے اہم مشروطیت طلب عالم دین سید عبداللہ بہبہانی کو ایک قاتلانہ حملے کے دوران شہید کردیا گیا اور یہ پتہ چلا کہ اس قتل میں ایرانی پارلیمنٹ کا ایک ایسا ممبر ملوث تھا جو انقلاب مشروطیت سے قبل اپنی دین مخالفت حرکتوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس خبر نے مشروطہ کے نئے ارباب اقتدار کے سلسلے میں علماء دین کی بدگمانیوں میں اور اضافہ کردیا۔ چنانچہ ایران کے نائب السلطنت کے نام ایک ٹیلیگرام میں آخوند خراسانی اور عبداللہ مازندرانی نے ''بڑے قومی لیڈران اور دین پرست مجاہدین'' کی جدو جہد کے سلسلے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے حکومت وپارلیمنٹ میں موجود مخرب وفاسد عناصر کی موجودگی ، ان کی مغرب پرستی اور اسلامی اصول وقوانین کے سلسلے میں ان لوگوں کی لاپرواہی پر اپنی ناراضگی وپریشانی کا

اظہار بھی کیا۔

مجموعی طور پر ان اسباب وعوامل نے عراق میں ایسی صورتحال پیدا کردی کہ مشروطیت طلب علماء کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور نوبت یہ آگئی کہ نجف اشرف میں بھی جو شیعہ علماء کی قدیم چھاؤنی اور مشروطہ طلب علماء کے اہم اور قسمت ساز فیصلوں کا مرکز تھا، علماء دین کی عزت وآبرو اور جان ومال محفوظ نہ تھی۔ طلباء اور عوام جو بالعموم مشروطیت کے مخالف تھے اور جن کو صحیح اطلاع بھی نہیں ہوا کرتی تھی ،مشروطہ طلب علماء کے خلاف تہمت لگانے سے باز نہیں آتے تھے اور یہ لوگ آخوند خراسانی جیسے نامور عالم دین پر بھی الزام عائد کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے تھے۔

یہی وہ وقت تھاجب روس اور برطانیہ کی فوجوں نے شمال وجنوب سے ایران پر قبضہ کرلیا (۱۳۲۹ء) شہر تبریز میں روسی افواج نے مشروطہ طلب عناصر کا قتل عام شروع کردیا اور مقتولین میں ثقۃ الاسلام تبریزی جیسے صاحب عظمت عالم دین بھی موجود تھے۔عراق پر بیرونی افواج کے قبضہ کی خبر سے علمائے عراق کے درمیان ایک بار پھر ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اپنی ناراضگی کے باوجود ان لوگوں نے تہران جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ ایرانی عوام کی مدد سے غاصب فوج کو ملک کے باہر نکال سکیں اور انقلاب مشروطیت کے سایہ میں جن لوگوں نے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے، ان پر بھی نگاہ رکھ سکیں۔عراق کے ہزاروں مسلح اور غیر مسلح افراد اور قبائلی نے علماء نجف وکربلا کی اطاعت میں ایران جانے کا فیصلہ کرلیا۔سید کاظم یزدی اگرچہ عراق سے باہر تو نہیں نکلے لیکن انہوں نے اپنے ایک بیان میں ایران پر روسی اور برطانوی فوجی حملے کی سخت مذمت کی۔علمائے نجف کا یہ قافلہ ایران کی طرف روانہ ہونے کے لئے پوری طرح آمادہ تھا لیکن جس روز اس قافلے کی روانگی تھی اسی دن صبح کے وقت مشکوک حالات میں آخوند خراسانی کی موت واقع ہوگئی۔

اگرچہ آخوند خراسانی کی موت کی وجہ سے دیگر علماء کے فیصلے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا اور وہ لوگ کاظمین کی طرف روانہ ہوگئے لیکن آخوند جیسی نمایاں شخصیت کے فقدان نیز ایرانی علماء اور حکمرانوں کی طرف سے ملنے والی مختلف اطلاعات کی وجہ سے وہ لوگ اپنے سفر ایران کو جاری نہ رکھ سکے اور اس طرح ایران کے سیاسی واقعات میں علماء کی براہ راست مداخلت اور مشروطیت کی صحیح قیادت کا دوسرا موقع بھی ہاتھ سے چلا گیا۔ ویسے تحریک مشروطیت میں اس دور کے مذہبی علماء سے اتنے عظیم کام کی امید بھی نہ کرنی چاہئے تھی کیونکہ ان لوگوں نے قدیم مذہبی روایات کے سایہ میں تعلیم

حاصل کی تھی اور طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی مذہبی مصروفیات بالکل روایتی انداز کی تھیں اور وہ اپنی روایتی مصروفیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے، اپنے فرائض کو انجام دیا کرتے تھے لہٰذا یہ بات ان روایتی علماء کے لئے کسی حد تک دشوار معلوم ہوتی تھی کہ مغرب سے تعلقات کے نتیجے میں ایران میں جو مسائل پیدا ہوگئے تھے انہیں وہ لوگ بخوبی سمجھ سکیں۔

سیاسی میدان سے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی علیحدگی کی وجہ سے مغرب پرست اور نام نہاد مشروطہ طلب افراد نے ملک وملت کو اپنی ذاتی ہوس اور سامراجی طاقتوں کی مفاد پرست خواہشات کا شکار بنانا شروع کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ ستار خان جیسے حقیقی مشروطہ خواہ شخص کے وجود کو بھی تحمل نہ کرسکے اور فقط ستار خان ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھیوں کے خلاف شرمناک پروپگنڈوں کا بازار گرم کردیا تاکہ عوام کے درمیان ان کا کوئی اثر ورسوخ باقی نہ رہ جائے۔ سماج میں اچھی طرح بدنام کرنے کے بعد ان لوگوں نے ستار خان پر بھی قاتلانہ حملہ کردیا اور اس حملے کی وجہ سے وہ ایک مدت تک بستر بیماری پر پڑے رہے اور بعد میں انتہائی غم انگیز حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ایرانی عوام کی عدالت پسندانہ تحریک میں بنیادی کردار ادا کرنے والی مذہبی اور قومی شخصیتیں دھیرے دھیرے اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئیں، جس کے نتیجے میں انقلاب دشمن افراد وعناصر نے اس انقلاب پر غلبہ حاصل کرلیا۔ پس یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی سے قبل مظفر الدین شاہ کا صدر اعظم عین الدولہ جو مشروطہ طلب لوگوں کا جانی دشمن تھا اور جس نے محاصرہ تبریز کے دوران بیرونی فوجوں کا اعلانیہ ساتھ دیا تھا، دس سال کا وقفہ گزرنے کے بعد مجلس شوریٰ ملی یعنی پارلیمنٹ کے ذریعہ دوبارہ صدر مملکت کا عہدہ حاصل کرلیتا ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ انقلابی جوش وخروش میں کمی آتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے ملک میں سیاسی گڑ بڑی، سماجی اختلافات اور اقتصادی مفلوک الحالی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا، ملک کی اقتصادی حالت میں اصلاح وسدھار کے بجائے اور زیادہ خرابی پیدا ہوگئی۔ ملک کے اکثر صوبوں میں علاقائی بغاوت شروع ہوگئی اور صوبائی حکام نے مرکزی حکومت سے علیحدگی اختیار کرنا شروع کردیا اور معاشرہ میں امن وسلامتی نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی۔ روس اور برطانیہ نے بھی پورے ایران میں پھیلی ہوئی گڑبڑی ومفلوک الحالی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک وملت پر اپنے ناجائز اثر ورسوخ میں حکومت نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان تو کردیا تھا لیکن جنگ میں سرگرم روسی، برطانوی اور عثمانی

حکومتوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنی فوجیں ایران میں داخل کردیں اور ایک دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی میں مشغول ہوگئے، ملک کے ماہرین سیاست اور قوم پرست افراد کے سامنے فقط یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ تہران سے ہجرت کرکے ملک کے مغربی حصہ میں چلے جائیں اور ایک عارضی حکومت کی تشکیل کرکے جرمنی اور ترکی کے ساتھ تعاون کا اعلان کردیں۔ لیکن ان لوگوں کی اس سیاسی تحریک سے بھی ایرانی عوام کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس عالمی جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہوا ہو لیکن ایرانی عوام کو ویرانی ومفلوک الحالی کے علاوہ کچھ نہ ملا اور اس ملک میں ہر طرف قحط، بھوک اور بیماری کا بول بالا ہوگیا۔ اس کے علاوہ مقامی گڑبڑی نیز ملک کے ہر گوشہ میں بیرونی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے استقلال وآزادی کا بظاہر خاتمہ ہوچکا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے آخری زمانہ میں روس میں انقلاب رونما ہوا اور متعدد داخلی وخارجی مسائل ومشکلات نیز ملک میں رونما ہونے والی جدید صورتحال کی وجہ سے روس میں اب اتنا دم نہ رہ گیا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ایران کے معاملات میں مداخلت کرے لیکن یہ تاریخی اور سنہری موقع بھی ایرانی حکومت اور عوام کے حق میں مفید وکارآمد ثابت نہ ہوا کیونکہ برطانوی فوجوں نے فوری طور پر پورے ملک پر اپنا فوجی اور سیاسی تسلط قائم کرلیا۔ ان لوگوں نے روس کی نئی حکومت کی نابودی وسرنگونی کے لئے دو ہتھکنڈے ایک ساتھ استعمال کئے۔ پہلے ایران میں تعینات روسی فوج کو جو بالعموم سابقہ حکومت کی طرف دار تھی، اپنے ہاتھوں میں لیکر اسے روس کی موجودہ عوامی اور انقلابی فوج کے مقابلے کے لئے بھیج دیا اور دوسرے مرحلے میں ایران کی نام نہاد کمیونسٹ تنظیموں کی تشکیل کرکے انہیں روس کی سیاسی اور فوجی تنظیموں کے اندر رخنہ اندزی کے لئے مقرر کردیا۔

ایسی صورتحال میں برطانیہ نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ ایران میں اپنی پسندیدہ حکومت قائم کرکے ایران میں اپنی فوجی اور سیاسی موجودگی کو قانونی حیثیت عطا کردے۔ لہٰذا ۱۹۱۷ء میں ایران میں وثوق الدولہ کی کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ وہ مشروطیت طلب افراد کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، آزادی پسند اور صاحب مہارت سیاستداں سمجھا جاتا تھا۔ اس کابینہ کی تشکیل کے ایک سال بعد حکومت برطانیہ نے وثوق الدولہ کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کئے جس کو ''معاہدہ ۱۹۱۹'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے بموجب فوجی، اور مالی کسٹم سے متعلق جملہ امور برطانوی مشیروں کے سپرد کردئے گئے تھے۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاہدہ نے ایران کو برطانوی نو آبادیاتی نظام کا حصہ

بنا دیا تھا۔

چنانچہ داخلی اور خارجی سطح پر اس معاہدہ کی بھر پور مخالفت ہوئی۔ ملک کے اندر بعض اراکین پارلیمنٹ مثلاً سید حسن مدرس جیسے لوگوں نے کافی بڑے پیمانے پر ایرانی کابینہ کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا ملک کے غیر معمولی جانبدار اور برطانیہ مخالف اخباروں اور رسالوں نے اس شرمناک معاہدہ کی وجہ سے وثوق الدولہ کا خوب مذاق اڑایا۔ آذر بائیجان میں شیخ محمد خیابانی اور گیلان میں میرزا کوچک خان جنگلی نے اس معاہدہ کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔ حکومت نے مخالف افراد کی گرفتاری اور مخالف اخباروں اور رسالوں پر سخت پابندی لگادی پھر بھی معاہدہ کے خلاف عوامی احتجاج میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بیرونی سطح پر برطانیہ سے سامراجی رقابت رکھنے والے ممالک مثلاً روس، امریکہ اور فرانس نے اس معاہدہ کی زور دار مخالفت کی اور نو تشکیل شدہ ''اقوام متحدہ'' نے بھی سرکاری طور پر اس معاہدہ کو تسلیم نہ کیا۔

وسیع اور شدید اختلافات اور مخالفتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے وثوق الدولہ نے معاہدہ کی عملی تعمیل کو روک دیا اور لازمی منظوری کے لئے اسے مجلس یعنی پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا۔ تیرہ سال بعد رونما ہونے والے اس واقعہ سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے بحرانی حالات میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے فاسد وخائن حکمرانوں نے تحریک مشروطیت کو کس حد تک منحرف کر دیا تھا۔

بہر حال وثوق الدولہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار باقی ہ رہ گیا تھا کہ حکومت سے مستعفی ہوجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مشیر الدولہ نامی شخص، جو سماج میں نیک نام مگر نہایت مصلحت اندیش تھا اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن ملک کے مسائل کا حل تلاش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا قبل اس کے کہ مشکلات اس پر غالب ہوجائیں اس نے خود ہی استعفیٰ دے دیا، واضح رہے کہ انقلاب مشروطیت کے بعد قومی رہنماؤں کی نظر میں بحرانی اور حساس سیاسی ماحول میں ''استعفیٰ'' ایک بہترین حل تھا کیونکہ ان لوگوں کو ملکی مفاد ومصالح کے مقابلے میں پنی ذاتی حیثیت وشان وشوکت زیادہ عزیز تھی، اسی وجہ سے جب کبھی انہیں اپنی حیثیت خطرہ میں نظر آتی، وہ فوری طور پر استعفیٰ دے دیا کرتے تھے، مشیر الدولہ کے مستعفی ہونے کے بعد کمانڈر جنرل فتح اللہ خان تنکابنی نے صدارت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی لیکن اس میں بھی اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ملک کے مسائل حل کر سکے۔

عالمی جنگ کے خاتمہ کے دو سال بعد نیز ملک سے روسی فوجوں کے نکل جانے کے بعد لوگوں

نے امید لگا رکھی تھی کہ اب مفلوک الحالی و بے سروسامانی فقر و گرسنگی اور تباہی و بربادی کا دور ختم ہوجائے گا لیکن مسند اقتدار پر ایران والے حاکموں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ داخل مسائل کا حل تلاش کرسکیں۔ اور یہ بات فقط وہ ایرانی عوام ہی نہیں بلکہ ایران کے سیاسی ماہرین بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ ملک کی فلاح و بہبود ان حکمرانوں کی صلاحیت سے باہر ہے لہٰذا سبھی لوگ کسی ایسے حادثہ کا انتظار کررہے تھے جو موجودہ صورت حال کو دگرگوں بنادے، مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ ماہرین سیاست کو فوج بغاوت اور عوام کو نجات و سلامتی کی فکر دامنگیر تھی۔

حوالے:
۱۔احمد کسروی، تاریخ مشروطہ ص۔ ۳۰ ۷
۲۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی ،ص۔ ۱۵۱ و ۱۵۲'' آخوند خراسانی''